ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دورۂ ترکی کے مشاہدات

(۸)

خلیل حامدی صاحب

انقرہ کے تاریخی نشیب و فراز انقرہ کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب مصطفیٰ کمال نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا تھا تو اس کی مجموعی آبادی ۲۰ ہزار سے متجاوز نہ تھی۔ مگر اب انقرہ دس لاکھ نفوس کی جولانگاہ بن چکا ہے اور ابھی تعمیر و توسیع کا ہنگامہ شب و روز برپا ہے۔ اس کا قدیم نام انگورہ ہے۔ اس کے تاریخی نشیب و فراز کا مجمل خاکہ یہ ہے کہ ۱۰۷۳ء میں اس چھوٹے سے مقام پر پہلی مرتبہ ترکوں نے قبضہ کیا۔ ۱۱۰۱ء میں یہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا اور رومی عیسائیوں کے زیرنگیں ہوگیا۔ ۱۲۲۷ء میں سلجوقی ترکوں نے اسے صلیب پرستوں سے آزاد کروا لیا۔ ۱۳۵۴ء میں یہ عثمانی قلمرو کا ایک حصہ بن گیا۔ ۱۴۰۲ء میں عثمانی فرمانروا سلطان بایزید یلدرم اور مغل فاتح تیمور کے درمیان یہاں وہ مشہور جنگ ہوئی جو تاریخ میں جنگِ انگورہ کے نام سے مشہور ہے۔ یونانیوں کے خلاف مصطفیٰ کمال پاشا نے آزادی کی جو جنگیں لڑی ہیں اُن میں مصطفیٰ کمال نے انقرہ ہی کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ اور جب مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں نے ترکی میں عثمانی خلافت کا خاتمہ کیا اور جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا تو انقرہ ہی کو جمہوریہ ترکیہ کا دارالحکومت قرار دے دیا۔ اس طرح ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے استنبول کی پونے پانچ سو سالہ اسلامی تاریخ عجائب گھر میں رکھ دی گئی اور انقرہ میں ایک نئے دارالحکومت کی کھدائی شروع ہوگئی۔ یہ ۴۶ سالہ دارالحکومت ابھی اپنے دورِ شباب میں ہے۔ ترکوں کو استنبول سے جو وابستگی تھی اُس کی وجہ سے شروع میں تو ان پر استنبول کے بجائے انقرہ کا "مرکزِ عقیدت" بن جانا بجلی بن کر گرا مگر اب وہ کشاں کشاں اِس تحویل پر راضی ہوتے

جا رہے ہیں اور ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچنے والوں پر اب اس شہر کی بعض خوبیاں بھی نمایاں ہو رہی ہیں۔ مثلاً یہ عثمانیوں کے پہلے دار الحکومت برصہ سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ عثمانیوں سے پہلے سلجوقیوں کا دار الحکومت قونیہ بھی اس سے چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ مگر حاجی ابراہیم قَیا کے الفاظ میں یہ تمام تاویلات ہیں جو ری پبلکن پارٹی کے حامیوں کی طرف سے گاہے بگاہے پھیلائی جاتی ہیں اور ان تاویلوں کی اب ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ مستقبل میں اگر ترکی میں اسلامی جمہوریہ بھی قائم ہو تو اس کا مرکز انقرہ ہی ہو گا۔ جس شہر نے الحاد اور لادینیت کا سرکاری طور پر اعلان کیا تھا وہی شہر انشاءاللہ اب خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ کی منادی کرے گا۔ یہاں کے صنم خانوں کے بلیے پر ایوانِ توحید تعمیر ہو گا۔ انقرہ کو بلاشبہ زود یا بدیر استنبول سے معافی مانگنی ہو گی اور اپنی نافرمانی کا عُذر پیش کرنا ہو گا، مگر انقرہ اب بوڑھے استنبول کی خاطر اپنی جوانی سے دستبردار نہیں ہو گا بلکہ اُس کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرے گا۔

"پردہ" دونوں میں سے کون چھاپے؟ افطاری ابراہیم قَیا صاحب کے ہاں کی۔ سعید اُزدمیر بھی افطاری میں شریک تھے۔ نمازِ عشاء تک ہماری مجلس جمی رہی۔ مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال ہوتا رہا۔ ایک موضوع یہ بھی تھا کہ حاجی ابراہیم قَیا صاحب مولانا مودودی کی کتاب "پردہ" کا ترکی ترجمہ کرا چکے ہیں۔ مگر ایک دوسرے ناشر جن کے پاس مولانا محترم کی کتابوں کے حقوق پہلے سے ہیں انہیں چھاپنے سے روک رہے ہیں۔ دونوں کی یہ کشمکش اب خاصی نزاکت اختیار کر چکی ہے۔ جذبات دونوں کے قابلِ قدر ہیں۔ مسابقت الی الخیر کا شوق دونوں میں وافر ہے۔ اور چونکہ ترکی میں مولانا محترم کی کتابوں کی مانگ بڑھ گئی ہے اس لیے اشاعتی ادارے بھی اس بارے میں بے قابو ہو رہے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی نزاع میں یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔ راقم الحروف نے قیامِ انقرہ کے دوران اس قضیہ کو نمٹانے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ فریقین کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے اور تبلیغ و اشاعت کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ ترکی کی اسلامی تحریک اور اس کے طریقِ کار اور مسائل و مشکلات پر بھی گفتگو ہوئی۔

گشت زارِ دعوت نمازِ عشاء اور تراویح کے لیے سعید اُزدمیر صاحب ہمیں انقرہ کے ایک قدیم محلّے میں لے گئے۔ سعید اُزدمیر اس محلّے کی جامع مسجد میں روزانہ درسِ قرآن و حدیث دیتے ہیں۔ رات کا وقت تھا۔ ہماری موٹر

کبھی اُوپر چڑھتی اور کبھی نیچے اُترتی۔ پُورا محلّہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچے پکے مکانات، ناپختہ سڑکیں۔ گویا ہم کسی دیہی آبادی میں اُتر گئے ہیں۔ کجا انقرہ کی رعنائی اور کجا اس محلہ کی بیچارگی۔ سعید اُزدمیر نے بتایا کہ اس محلّے کی ظاہری پژمردگی اور اُداسی کو نہ دیکھیں۔ اس کے اندر بڑے قیمتی جوہر بستے ہیں۔ ہم اس محلّے میں مدتوں سے خالص اسلامی دعوت کا کام کر رہے ہیں۔ یہاں کے بوڑھے اور بچّے اور مرد اور عورتیں سبھی ہماری دعوت سے آشنا ہیں۔ الیکشن کے زمانے میں اِس محلّے نے کئی سرفرازوں کو سرنگوں کر دیا۔ ۱۹۶۰ء میں محترم عصمت انونو نے الیکشن میں اپنی پارٹی کی ناکامی پر کہا تھا کہ مجھے نُور طلبہ نے برباد کیا ہے۔ بے شک اس محلّہ کی اکثریت غریب اور مفلس ہے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ہے۔ مگر اسلامی جوش و جذبہ اور غیرت و حیا اور باہمی تعاون و تکافل اس محلّے کی نمایاں خوبی ہے۔ ہم نے انقرہ میں دعوت و تبلیغ کے لیے جو مختلف حلقے بنا رکھے ہیں یہ اُن میں سے ایک ہے۔ اِس محلّے کا باشندہ اپنی جان دے سکتا ہے مگر اپنا ایمان نہیں بیچ سکتا۔ سعید اُزدمیر اس محلّے کے ذکر میں ایسے رطب اللسان ہوتے جیسے کوئی کاشتکار اپنی لہلہاتی کھیتی کو دیکھ کر پھولا نہ سما رہا ہو۔ قاآنی کے الفاظ میں:

ز از خاک و خشتہا دمیدہ سبز کشتہا
چہ کشتہا، بہشتہا نہ دہ نہ صد ہزارہا

گاڑی میں سعید اُزدمیر اور ابراہیم قیا صاحب کے علاوہ اور بھی تین ساتھی تھے جو راستے میں سوار ہو گئے تھے۔ اس محلّے کا تعارف کرانے کے بعد یہ تمام حضرات جن میں خود سعید اُزدمیر بھی تھے جوش میں آ کر اپنا مخصوص نوری ترانہ بآواز بلند پڑھنے لگے۔ چند مفردات کے سوا میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ مگر پڑھنے والوں کی لَے اور جہاد، اسلام، خلافت اور نور و عرفان اور اسی نوعیت کے دوسرے الفاظ کا بار بار اعادہ بڑا وجد آور تھا۔ ترک سُریلی آواز اور نغمگی کے رسیا ہیں۔ ہمارے نوری بھائیوں نے بھی اپنی دعوت میں ان مؤثر ہتھیاروں کو شامل کر رکھا ہے۔

محلّے کی مسجد میں نماز سے پہلے مجھے تقریر کرنے کے لیے کہا گیا۔ مسجد نمازیوں سے اس قدر بھر رہی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بوڑھوں کی اکثریت باریش۔ نوجوانوں میں بھی خاصی تعداد کے چہرے پر ڈاڑھی۔ پندرہ منٹ تک میں نے تقریر کی۔ سعید اُزدمیر میرے مترجم تھے۔ پہلے میں نے اپنے ترک بھائیوں کو پاکستان کے حالات اور مذہبی اور تحریکی سرگرمیاں بتائیں اور انہیں یقین دلایا کہ پاکستان میں اِن شاء اللہ اسلامی نظام قائم ہوگا۔ پھر مختصراً

عرب قومیت، طورانی قومیت اور اس طرح کے دوسرے جاہلی نعروں کی حقیقت بتائی اور یہ واضح کیا کہ عربوں کو اسرائیل کے ہاتھوں جو مصیبتیں پہنچ رہی ہیں یہ دراصل اللہ کی طرف سے انہیں اس بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد عربوں نے ترکوں کے مقابلے میں برطانوی سامراج کا ساتھ دیا تھا۔ اور یہ کہ اگر اب بھی عرب مسلمانوں کو نظرانداز کرکے اور اسلام سے بے نیاز ہو کر اسلام دشمن طاقتوں کے آلۂ کار بن کر اسرائیل کا مقابلہ کرنا چاہیں گے تو ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اسرائیل کا خاتمہ صرف جہادِ اسلامی، اور اسلامی اتحاد اور رجوع الی اللہ پر موقوف ہے۔ آخر میں ترک حاضرین کو ان کی اسلام پسندی کی داد دی اور جس مختصر وقفے کے اندر ترک مسلمان نے اپنے ہاں کے حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا ہے اُس پر انہیں بتایا کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمان اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نماز تراویح کے بعد اس مسجد میں موئے مبارک کی زیارت کرائی گئی۔

طلبۂ نور کے ایک اجتماع میں مسجد سے نکل کر ہم اُسی محلے میں ایک رفیق کے مکان پر چلے گئے۔ یہاں نور طلبہ کا اجتماع تھا۔ مختصر سے تعارف کے بعد سعید اُزدمیر نے اجتماع کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اجتماع کی شکل یہ تھی کہ اکثر حاضرین کے ہاتھ میں بدیع الزماں نورسی مرحوم کی کتاب لمعات تھی۔ سعید اُزدمیر نے اس کتاب کے بعض حصوں کو پڑھ کر سنایا اور ان کی اپنی زبان میں تشریح کی۔ بدیع الزماں نورسیؒ کی جتنی تصنیفات ہیں وہ باقاعدہ کتابی شکل میں مدون نہیں کی گئیں بلکہ مرحوم کے دروس اور خطبوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اور اُن میں شریعت کے تفصیلی احکام پر[illegible] کے بجائے اساساتِ دین اور اسلامی عقائد و اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ سعید اُزدمیر جب فارغ ہوئے تو ایک دوسرے "نورسی" اُٹھے اور انہوں نے زیرِ درس مباحث کو بدیع الزماں مرحوم کی بعض دوسری تشریحات سے مزید اُجاگر کیا۔ الغرض اکثر احباب نے متعلقہ موضوع پر اپنے اپنے مطالعہ کی مدد سے روشنی ڈالی۔ گو لوگوں نے ہاتھ میں ایک ایک کتاب اٹھا رکھی تھی مگر میں متحیّر تھا کہ ہر شخص نورسی مرحوم کے بیانات و افادات کو ازبر کیے ہوئے ہے اور صفحات کے صفحات زبانی سُنا رہا ہے۔ سعید اُزدمیر نے مجھے بتایا کہ بدیع الزماں نورسی مرحوم کے تمام چھوٹے بڑے رسائل کی مجموعی تعداد ۱۳۰ ہے۔ ان میں سے اہم رسالے ہم سب نے یاد کر رکھے ہیں بلکہ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے یاد ہو گئے ہیں۔ نور طلبہ کو (سفید ریش بوڑھے بھی اپنے آپ کو "نور طالب" کہتے ہیں) بدیع الزماں نورسی سے جو محبت اور عقیدت ہے اگر میں اُسے عشق سے تعبیر کروں تو مبالغہ نہ ہو گا۔ اس عظیم

شخصیت نے نہ صرف اپنے شاگردوں اور پیروکاروں کے عقائد و افکار کی اصلاح کی ہے بلکہ ان کی سیرت و کردار پر بھی اس قدر اثر ڈالا ہے کہ لادینیت اور الحاد اور فسق و فجور کے بحرِ متلاطم کے اندر رہ کر بھی وہ تر دامن نہیں ہوئے۔ اجتماع میں کچھ اور امور پر بھی اظہارِ خیال ہوتا رہا جو میری سمجھ سے باہر تھے۔ جب لوگ اپنے معمولات سے فارغ ہوئے تو اب میری باری آئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں جماعت اسلامی کی دعوت اور طریق کار پر مفصل تقریر کروں۔ ترکی قہوہ کی ایک فنجان نوش کرنے کے بعد میں نے داستان سرائی شروع کر دی اور دو گھنٹے تک اس موضوع کے مختلف گوشوں پر کلام کرتا رہا۔ جماعت کی تشکیل سے پہلے مولانا مودودی مدظلہ العالی کس طرح اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرتے رہے۔ جماعت کی تشکیل کب اور کن حالات میں ہوئی۔ جماعت کا نظم اور دستور کیا ہے۔ جماعت اپنی دعوت کے چاروں اجزاء کو کس توازن اور اعتدال اور کن ذرائع و وسائل کے ساتھ بروئے کار لا رہی ہے، یعنی تطہیرِ افکار و تعمیرِ افکار۔ صالح افراد کی تلاش اور تنظیم و تربیت۔ اصلاح معاشرہ۔ اور نظام حکومت کی اصلاح۔ اس ضمن میں میں نے جماعت کی وہ تمام اسکیمیں اور سرگرمیاں اور کوششیں ملخصاً بیان کر دیں جو جماعت انفرادی تربیت اور نظم جماعت کی حفاظت اور دیکھ بھال سے لے کر سیاست، تعلیم، صحافت، خدمتِ خلق اور دعوت و اشاعت کے باب میں سرانجام دے رہی ہے۔ اخوانِ نور نے یہ باتیں بڑی دلچسپی سے سنیں۔ بلکہ دورانِ تقریر جہاں کہیں انہیں وضاحت درکار ہوتی مجھے روک کر وضاحت طلب کرتے۔ آخر میں جب میں اپنے طور پر یہ تقریر ختم کر چکا تو مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ میں جماعت کے بانی مولانا مودودی کے حالاتِ زندگی بھی تفصیل سے بیان کروں۔ میں نے مختصراً مولانا محترم کی سوانح حیات بیان کی اور عرض کر دیا کہ اگر کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہو تو پوچھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سوالات و جوابات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا جسے سعید اُزدمیر نے آخر کار حکماً بند کر دیا۔

سعید اُزدمیر نے اپنے اختتامی کلمات میں حاضرین کے سامنے یہ اشارہ کر دیا کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کی جو دعوت ہمیں بتائی گئی ہے یہ عین وہی چیز ہے جسے بدیع الزمان نورسی مرحوم زندگی بھر پیش کرتے رہے ہیں اور جسے روبکار لانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ الفاظ اور ترتیب کا فرق ہو سکتا ہے، روح اور جوہر اور مدعا یکساں ہے۔ طریق کار میں بھی قدرے تفاوت ہے مگر وہ بھی مقامی حالات

کی وجہ سے ہے۔

طلبۂ نور سے میری جتنی بھی ملاقاتیں اور گفتگوئیں ہوتی ہیں اُن سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان لوگوں کے اندر ایمان اور اسلام کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دین کی راہ میں ہر طرح کی قربانی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ جذبات میں بڑی زندگی اور ہیجان ہے۔ مگر دین کے حقائق اور فلسفہ اور عمیق شعور کی ان کے اندر کمی ہے۔ ان کے پاس اسلام کے بارے میں جتنا لٹریچر ہے وہ ہلکا پھلکا سا ہے۔ اُس میں یہ پہلو بے حد تشنہ ہے کہ اسلام کس طرح ہمیں ہر پہلو میں ایک مکمل ضابطۂ حیات دیتا ہے اور اس کے اصولوں کو موجودہ دور کی سوسائٹی اور ریاست کے حالات پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ خود نورسی مرحوم کے مواعظ اور درس بھی ایمانیات تک محدود ہیں۔ اتحاد اور خلافتِ اسلامی اور نفاذِ شریعت کا وہ مطالبہ کرتے رہے ہیں مگر اجمالی انداز کے ساتھ۔ البتہ اب یہ لوگ اخوان المسلمون کے رہنماؤں اور مولانا مودودی مدظلہٗ العالی کی تصنیفات بڑی تیزی کے ساتھ ترکی زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ یہ تصنیفات اُن کے شعور کو پختہ تر کرنے میں کافی ممد ثابت ہو رہی ہیں اور تعلیم یافتہ طبقے میں برق رفتاری کے ساتھ پھیل رہی ہیں۔

یہ لیلۃ القدر ہے یعنی رمضان المبارک کی ستائیسویں شب۔ یہاں کا ریڈیو اگرچہ ایک آزاد ادارہ ہے اور تجارتی بنیادوں پر قائم ہے مگر اس کا کنٹرول ملحد، لادین اور یہود نواز عناصر کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود ستائیسویں شب کو اُس نے کوئی ایسا پروگرام نشر نہیں کیا جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ تمام رات اس کا پروگرام جاری رہا۔ مذہبی موضوعات پر تقریریں ہوتی رہیں۔ حمد و نعت پیش کی جاتی رہی۔ قرآن کی تلاوت ہوتی رہی اور مختلف ترکی قراء اپنے کمالاتِ فن سے دلوں کو گرماتے رہے۔ ترکی کے محکمۂ مذہبی امور کے سربراہ، اُن کے نائب، وزیر اعظم، پارلیمنٹ کے ارکان اور دوسری نمایاں شخصیتوں کے پیغامات نشر ہوتے رہے۔ ترکی کے تغیر پذیر حالات میں یہ چیز بسا غنیمت ہے۔ رات ہوٹل میں سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند غائب ہو چکی تھی اور یہ فکر لاحق تھی کہ کب لندن پہنچوں اور مولانا محترم سے ملوں۔

سفارت خانہ پاکستان آج ۱۹ دسمبر ہے اور جمعرات کا دن۔ حاجی ابراہیم قیا کے صاحبزادے علاؤالدین قیا کو لے کر پاکستان کے سفارت خانہ میں گیا تاکہ لندن کی انڈورسمنٹ کراؤں اور پھر اوّلین فرصت میں

لندن روانہ ہو جاؤں۔ جدہ میں انڈورسمنٹ بننے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ ایوب صاحب نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنے مخالفین کے ساتھ جس تنگ نظری، ذاتی پرخاش اور کینہ توزی کا برتاؤ کیا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان کے دور میں پاکستان کے اکثر سفارت خانے مخالفین کے خلاف محکمۂ جاسوسی کا کام کرتے رہے۔ اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ کجا یہ کہ مخالفین کے لیے غریب الوطنی میں سہولتیں فراہم کریں۔ امید ہے ان سفارت خانوں کا "موڈ" اب بدل چکا ہوگا۔ پاکستانی سفارت خانہ میں عصر تک اپنی درخواست لیے بیٹھا رہا۔ سفارت خانے کے عملہ کی طرف سے "خوش آمدید" کے جذبے کا اظہار تو نہیں ہوا البتہ مجموعی برتاؤ اور اندازِ گفتگو برا نہ تھا۔ انتظار گاہ میں دوسروں کے ساتھ وقت کاٹتا رہا۔ سفارت خانہ کی لائبریری میں اردو ادب کا اچھا ذخیرہ موجود ہے مگر الماریوں کو تالے لگ رہے تھے اس لیے اس سے استفادہ بھی ممکن نہ رہا۔ ایک بجے کے قریب معلوم ہوا کہ اکثر ذمہ دار اصحاب لنچ کے لیے اٹھ گئے ہیں۔ رمضان المبارک کے آخری ایام اور لنچ!! یہ ایک مسلمان ملک میں اسلامی جمہوریۂ پاکستان کی نمائندگی ہو رہی تھی۔

نئے انقرہ کی ایک مسجد علاؤ الدین قیا سے میری گفتگو انگلیوں اور آنکھوں سے ہوتی یعنی لغۃ الاشارہ ہمارا واحد سہارا تھی۔ ہم دونوں نماز ظہر کے لیے نکل گئے۔ ہمارا سفارت خانہ انقرہ کی بالکل نئی اور فیشن ایبل آبادی میں واقع ہے۔ جیسے کراچی کی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ امید نہ تھی کہ اس آبادی میں کوئی مسجد مل جائے گی۔ مگر سفارت خانہ کی پشت پر ہی چند قدم آگے چل کر ایک نئی خوبصورت اور صاف و شفاف مسجد مل گئی۔ نماز ظہر کی حاضری بھی خوب تھی۔ ترک نمازی جماعت کے انتظار میں بیٹھے تسبیح گردانی اور قرآن خوانی میں مشغول تھے۔ انقرہ کو جب دار الحکومت بنایا گیا تھا تو وہاں کوئی نئی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چند قدیم مسجدیں مثلاً: جامع حاجی بیرم خاں، اور جامع علاؤ الدین کیقباد سلجوقی موجود تھیں۔ مگر ان پر بھی خزاں طاری ہو چکی تھی۔ اتاترک نے جسے اب تک ہمارے ہاں کے سادہ لوح لوگ غازی کہتے ہیں، جدید انقرہ کو مسجدوں سے بزعمِ خود "پاک" رکھا تھا۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ اس پابندی کو اٹھایا اور اپنی ذاتی رہائش گاہ کے قریب اپنے خرچ سے ایک مسجد تعمیر کروائی۔ ترک عدنان مندریس کو مسجدوں اور سڑکوں کا وزیر اعظم کہتے ہیں۔ یہ پابندی اٹھ جانے کے بعد اب انقرہ میں جا بجا نئی

مسجدیں بن رہی بلکہ خود محکمۂ امورِ مذہبی کی طرف سے سرکاری خرچ پر وسطِ انقرہ میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کی جا رہی ہے جس کا تخمینہ ۲ کروڑ ترکی پاؤنڈ ہے۔

مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے دفتر میں علاؤالدین قیبلا نے میری مایوسی اور اکتاہٹ کو دیکھ کر ایک اچھا حل نکال لیا۔ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے دفتر میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر سلیمان عطش سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف انقرہ یونیورسٹی کی الٰہیات فیکلٹی میں تفسیر کے پروفیسر ہیں۔ بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے۔ نہایت شُستہ اور فصیح عربی بولتے ہیں۔ انگریزی اور فرنچ کے بھی عالم ہیں۔ مولانا محترم کی صحت و عافیت کے بارے میں دریافت کیا۔ فیڈریشن کے بارے میں بتایا کہ انقرہ کے علاوہ استنبول، قیصریہ، ازمیر اور قونیہ میں فیڈریشن کے بڑے اثرات ہیں۔ یہ فیڈریشن اسلامی نظامِ تعلیم کی علمبردار ہے اور طلبہ کے اندر مغربیت کے اثرات کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ پاکستان کے متعدد لوگوں سے ڈاکٹر عطش کا تعارف ہے۔ آر سی ڈی کی طرف سے سکالرشپ پر پاکستان آ رہے ہیں۔ "اسلام مدنیت" نامی ماہوار رسالہ اسی فیڈریشن کی طرف سے نکلتا ہے۔ دفتر سے نکلے تو علاؤالدین قیا کے اشارہ پر میں بھی اُن کے ساتھ پیدل چل پڑا چلتے چلتے ہم انقرہ کی سب سے بڑی مارکیٹ میں پہنچ گئے۔ یہ ۲۰ منزلہ عمارت ہے۔ اس میں ہر چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ ایک کوآپریٹو سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہے۔ ایک منزل میں ایک ہی نوعیت کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ فروخت کا کام لڑکیاں سرانجام دیتی ہیں جنہوں نے اپنے بالوں کے ڈیزائن تیار کرنے میں یقیناً گاہکوں کی پسند کا لحاظ رکھا ہوگا۔ علاؤالدین مجھے کئی منزلوں تک لیے لیے پھرتا رہا۔ میں اُسے یہ نہ سمجھا سکا کہ یہ فضا جس میں آوارگی انتہا پر ہے، عُریانی مذاقِ سنجیدہ کا منہ چڑا رہی ہے اور چشم و ابرُو اور ساق و سینہ کی بے باکانہ نمائش ہو رہی ہے، مجھے پسند نہیں ہے۔ آخر کار مارکیٹ سے نکلتے وقت میں نے ایک سٹور سے چھوٹی قینچی خریدنا چاہی۔ جب قیمت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ۳۰ ترکی لیرے۔ سعودی عرب میں ہوتا تو اسے ایک ریال میں خریدتا۔ اندازہ ہوا کہ ترکی کا اقتصادی نظام غیر متوازن ہو رہا ہے اور انقرہ استنبول کی نسبت کئی گنا زیادہ گراں ہے۔ اور بھی کئی موقعوں پر اس اقتصادی ناہمواری کے ثبوت ملے۔

واپس سفارت خانے آئے اور عصر کے وقت فارغ ہو کر (بصد یاس و حسرت) واپس چلے گئے۔ مکتبۂ نور

پہنچے تھے کہ ہمارے عزیز دوست صالح اوزجان کا آدمی آگیا اور مجھے ماہنامہ ہلال کے دفتر لے گیا۔ انقرہ آنے کا ایک مدعا صالح اوزجان سے ملاقات تھی۔ انقرہ ہوٹل میں ہم نے افطاری کی اور وہاں سے شرق اوسط یونیورسٹی چل دیئے۔ یہ یونیورسٹی ترکی کے وزیراعظم سلیمان بک ڈیمرل کے بھائی علی بک ڈیمرل نے قائم کی ہے۔ اور وہی اس کے مالک بھی ہیں اور چانسلر بھی۔ (باقی)

بقیہ: سانحۂ مسجدِ اقصیٰ

اس منصوبے کے اہم ترین اجزاء دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجدِ اقصیٰ اور قُبّہ صَخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقاماتِ مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہوسکتی۔ دوسرے یہ کہ اُس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزاء کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔

جہاں تک پہلے جزء کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اُسی وقت قادر ہوچکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تأمل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکہ کو دنیائے اسلام کے شدید ردِّعمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔ ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر تو مسیح ہی آکر کرے گا، جب تک وہ نہ آجائے ہمیں انتظار کرنا چاہیے[1]۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔ دوسرا گروہ جو جدّت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوارِ گریہ

---

[1] واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح موعود (PROMISED MESSIAH) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجال قرار دیا ہے۔